بریگیڈیئر صدیق سالک بحیثیت نثر نگار

مسرت شاہین

Musarrat Shaheen

محمد اجمل

Muhammad Ajmal

M.Phil Scholars, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

Brigadier Siddique Salik was high profile military officer. He served as 8th director general of ISPR (Inter Services Public Relations). He was a combat artist,great humorist, illustrious novelist and notable memoirist. In his books "Main Ne Dhaka Doobtay Dekha" & "Witness to Surrender" he explains various phenomenal facts that led to the fall of Dhaka and creation of Banghladesh. He depicted a clear picture of our social life and its both sides, poverty and feudalism in "Emergency & Pressure cooker". He can observe the lighter sides of anything while writing about war or anything else going pitiful. He has great courage of smiling at the miseries of life; as he does in "salute" & "Hama Yaran dozakh". His wit, satire, allegorical and symbolic style differs him from the other Humorist writers. He is remembered as strongest pillar of our literary edifice. There is no doubt about it that such writers are born centuries later.

افواج پاکستان (جس کا نصب العین ہی ایمان، تقوی اور جہاد فی سبیل اللہ ہے) عزم عالی شان کا نشاں، ملکی سالمیت کے پاسباں اور بہادری کی وہ لازوال داستان ہے جس پر اہل وطن تو نازاں ہیں ہی اغیار بھی رشک کرتے ہیں۔ دھرتی کے ان جری سپوتوں میں چند نام ایسے بھی ہیں جو اپنے فرائضِ منصبی نبھانے کے ساتھ اہل قلم میں بھی اوجِ کمال رکھتے ہیں

فوج کے لیے ایک عمومی تاثر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس سے وابستہ لوگ 'حسِ مزاح' سے محروم ہوتے ہیں تاثر بالکل درست نہیں ہے بلکہ یہ امر کسی اور حقیقت کا متقاضی ہے۔ افواج پاکستان کے اہل قلم اکابرین میں کرنل محمد خاں، بریگیڈیئر صدیق

سالک، لیفٹیننٹ جنرل شفیق الرحمٰن، بریگیڈیئر صولت رضا، میجر سید ضمیر جعفری اور کرنل اشفاق حسین ایسے نام ہیں جنھوں نے حالتِ جنگ کے اعصاب شکن حقائق اور قید و بند کی مصیبتوں کو تلخ و شیریں چاشنی دے کر صفحۂ قرطاس کے سپرد کیا اور طنز و مزاح سے ایک ایسے ہتھیار کا کام لیا ہے کہ کسی شعوری کوشش سے حقیقت بھی مسخ نہ ہونے پائے اور قلم کی حرکت بھی برقرار رہے۔

بریگیڈیئر جنرل صدیق سالک کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں مزاح نگاری اور تنقید کا عنصر غالب ہے۔ جو کہ موضوعیت اور معروضیت کا حسن امتزاج ہیں۔

بریگیڈیئر جنرل صدیق سالک ۶ ستمبر ۱۹۳۵ء کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چوہدری رحمت علی کاشتکار تھے۔ صدیق سالک ابھی عمر عزیر کے ڈھائی سال ہی پورے کر پائے تھے کہ باپ کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئے۔ معاشی حالات خراب ہونے کے باعث ان کی عالی ہمت والدہ نے تین بیٹیوں اور اپنی واحد اولاد نرینہ کی پرورش محنت مزدوری سے کی۔ ان کے گاوں میں کوئی پرائمری سکول نہ ہونے کے باعث اسلامیہ سکول ملکہ میں داخل ہوئے۔ اسی دوران حافظ محمد حیات سے قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ ٹھوٹھہ رائے بہادر سے مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد میٹرک امتیازی نمبروں سے پرائیویٹ پاس کیا۔

زمیندارہ کالج سے ایف۔اے کا امتحان پاس کرنے کی بعد ۱۹۵۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں بی۔اے آنرز کیا۔ ۱۹۵۹ء میں انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد بین الاقوامی تعلقات میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔

اسلامیہ کالج فیصل آباد میں ملازمت اختیار کی۔ اسی دوران پبلک سروس کمیشن سے ملازمت ملنے پر بطور لیکچرار پہلی تعیناتی گورنمنٹ کالج مانسہرہ میں ہوئی۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن میں ایک ہفت روزہ ''پاک جمہوریت'' میں بحیثیت مدیر خدمات سرانجام دیں۔ ایک سال بعد یہ پرچہ بند ہونے پر انھیں محکمہ اطلاعات و نشریات میں پی۔آر۔او مقرر کیا گیا۔ اسی دوران پاک فوج کی ایک تشہیر اسامی کے لیے انٹرویو دیا اور کامیاب ہو گئے۔ ۱۹۶۴ء میں ملازمت بطور کپتان کے اُڑان بھی اپنی سالگرہ کے دن ۶ ستمبر کو بھری۔ ابتدائی فوجی تربیت مکمل کرنے کے بعد ان کا تقرر بطور پبلک ریلیشن آفیسر آئی۔ایس۔پی۔آر کے ہیڈ کوارٹر میں ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں میجر کے عہدے پر ترقی پا کر ڈھاکہ کے لیے رختِ سفر باندھا۔ پھر سانحہ مشرقی پاکستان واقع ہوا جس میں جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ دو سال ہندوستان کی قید میں رہے۔ ۱۹۷۳ء میں وطن واپس آئے (انھیں شملہ معاہدے کے تحت قیدیوں کے تبادلے میں رہائی ملی)۔ ۱۹۷۷ء میں لیفٹیننٹ کرنل بنے اور اسی سال کرنل بن گئے۔ جنرل ضیاالحق نے اقتدار سنبھالا تو انھیں چیف مارشل لا سیکرٹریٹ میں پریس سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز (ISPR) کے ڈائریکٹر بنے۔ اگست ۱۹۸۸ء میں سانحہ بہاولپور کے فضائی حادثے میں شہید ہوئے۔ انھیں اپنے آبائی گاوں سے بہت پیار تھا وہاں پر علم کی ترقی و ترویج کے خواہش مند تھے۔ طالبات کے لیے ہائی سکول کے قیام میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔

''ہمہ یاراں دوزخ'' صدیق سالک کی یاداشتوں پر مبنی کتاب ہے۔ مشرقی پاکستان تاریخ کا وہ سانحہ ہے جس کا گھاؤ آج بھی ہر پاکستانی محسوس کرتا ہے۔ اس میں انھوں نے سکوت ڈھاکہ کے اسباب، سیاسی حالات، زمینی حقائق اور ہمسایہ ملک کی چیرہ دستیوں کا ذکر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ سانحہ رونما ہوا۔ اس کتاب کا نہ صرف معنی خیز عنوان مصنف کے دلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ کتاب کے عنوانات سے بھی سفر کی درد نا کی اور دل کو بوجھل کر دینے والے حقائق کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ کلکتہ میں کال کوٹھری کے منظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

''میں توکل برخدا چھ فٹ کمرے میں لیٹ گیا۔ایک دیوار سر کو لوحِ مزار کی طرح چھو رہی تھی تو دوسری کو مزید پھیلنے سے روک رہی تھی۔عین قبر کا عذاب تھا۔عذابِ قبر مکمل کرنے کے لیے وہاں سانپ اور بچھو تو نہ سہی البتہ مچھر، پسو اور کھٹمل خاصی تعداد میں سرگرمِ عمل تھے۔کچھ تو کمرے میں پہلے ہی موجود تھے اور کچھ شب خون مارنے کے لیے کمبلوں میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔کمبل اوڑھتا تو حشرات الارض خون پینے لگتے۔اتارتا تو کپکپی جان نہ چھوڑتی۔''(۱)

ان cells میں مقید ہر پاکستانی کو ایسی ہی صورتحال کا سامنا تھا۔جہاں قیدِ تنہائی کے ساتھ ساتھ بھوک اور موسموں کی شدت سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا۔بریگیڈیئر سالک نے ثابت کیا کہ اگر زہر سے تریاق کشید کیا جا سکتا ہے،کوئلے سے ہیرا برآمد ہوسکتا ہے تو ناگفتہ بہ حالات سے بھی خوشی اور مسرت کے چند لمحات نکالے جا سکتے ہیں۔آگرہ جیل شفٹ کیے جانے پر اور میجر خالق کے پرزور اصرار پر کلام اقبال پڑھنے پر کہتے ہیں:

''غسل خانوں سے ذرا ہٹ کر ایک خاموش گوشہ کلاس روم کے طور پر منتخب کیا۔استاد کے مونڈھا اور کلاس کے لیے بنچ بچھائے گئے اور ہم ایک غزل یومیہ کے حساب سے پڑھنے لگے۔چند ہی دنوں میں کلاس کی تعداد بڑھنے لگی اور مجھے مقبولیت کا احساس ہونے لگا لیکن ''اے طائرِ فریب خوردہ! تو کس دام میں آ پھنسا؟'' جلد ہی مجھ پر وا ہوا کہ میجر خالق نے بہلا پھسلا کر مجھے اس کام میں مبتلا کیا ہے۔انھوں نے محض میرا مذاق اُڑانے کے لیے اقبال سے اپنی ناواقفیت کا ڈرامہ کھیلا ہے۔دراصل وہ سب حضرات کلامِ اقبال مجھ سے بہتر سمجھتے تھے۔مجھے اس کا علم یوں ہوا کہ میں کئی دفعہ کسی شعر کی ''استادانہ'' تشریح کر بیٹھتا تو میجر خالق کی کلاس کا کوئی رکن نہایت شاگردانہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر کُچھ کہنے کی اجازت طلب کرتا اور جب میں استادانہ وقار کے ساتھ سر اثبات میں ہلا کر عرضِ مدعا کی اجازت دیتا تو وہ اسی شعر کے مرکزی خیال کے گہرے سمندر سے معانی کے ایسے درشہوار نکال لاتا کہ مجھے اپنے سطحی علم پر ندامت ہونے لگتی۔میں دام میں پھنس کر بہت پھڑ پھڑایا لیکن میجر خالق ٹھہرے سینئر۔حکم ہوا ''پڑھاؤ گے اور ضرور پڑھاؤ گے جب تک کلام اقبال ختم نہیں ہوتا یا وطن واپسی نہیں ہوتی (جو بھی پہلے ہو) یہ سلسلہ جاری رہے گا۔''(۲)

''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا''

قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ،سقوطِ مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش کی آزادی کوئی سا بھی نام دے لیں،درد کی نوعیت ایک ہی رہتی ہے۔۶ دسمبر۱۹۷۱ء پاکستان کی تاریخ کا وہ سیاہ دن جس نے وطنِ عزیز کو دولخت کر دیا۔صدیق سالک سقوط ڈھاکہ کے عینی شاہد ہیں انھیں اس سانحہ سے دو سال قبل ڈھاکہ میں بطور میجر تعینات کیا گیا تھا۔انھوں نے اہم ترین سیاسی اور عسکری واقعات کو رونما ہوتے دیکھا۔اپنی یادداشتوں کو وہ ''Witness to the surrender'' کے نام سے لکھتے ہیں یعنی 'شکست کی گواہی' اور پھر اسی کا اردو ترجمہ ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' کی صورت میں سامنے آتا ہے۔یہ کتاب اس لیے بھی

اہمیت کے حامل ہے کہ یہ سکوت ڈھاکہ کے فوراً بعد لکھی گئی۔انہوں نے حقائق کو کسی بھی ذہنی یا نفسیاتی تحفظ کے بغیر بیان کیا۔کسی بھی قومی ونظریاتی سانحے کو کسی طوفان یا زلزلے سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی کہ وہ اچانک رونما ہو کے قیامت برپا کردے بلکہ اس کے پیچھے ایسے بہت سے عوامل ہوتے ہیں جو لاوا کی طرح اندر ہی اندر پنپ رہے ہوتے ہیں جو موافق حالات میں آتش فشاں کی طرح پھوٹ پڑتے ہیں۔

کتاب کے پہلے ہی باب میں وہ مجیب الرحمٰن کے عزائم کو آشکار کرتے ہیں جس کا اظہار وہ قریبی حلقوں میں بنگلہ دیش کے قیام اور انتخابات کے ختم ہوتے ہی ''ایل ایف او'' کو پرزے پرزے کردینے کے الفاظ میں کرتا ہے۔اپنے انہی شکوک کے پیشِ نظر لکھتے ہیں:

> ''میں جب راولپنڈی سے ڈھاکہ روانہ ہوا تو رختِ سفر بڑا مختصر تھا مگر میرے ذہن میں خیالات کا وزن بہت بھاری تھا۔ یہ خیالات ملکی سالمیت سے متعلق تھے مگر اس وقت اس سلسلے میں ہندوستان کی امکانی جارحیت کی بجائے اندرونی سیاست کے مدوجزر کا زیادہ احساس تھا۔کیونکہ مغربی پاکستان جہاں میں نے پچیس سال گزارے یہ تاثر عام تھا کی مجیب کے چھ نکات علیحدگی کی درپردہ سکیم کا دوسرا نام ہے اور بعض حلقوں میں یہ بات بھی اکثر سننے میں آئی تھی کہ ۱۹۶۸ء کی اگرتلا سازش میں اس سکیم کو بروئے کار لانے کے لیے عملی اقدام تھا۔ان دنوں مشرقی پاکستان میں پچیس ہزار کے لگ بھگ فوجی تعینات تھے۔میں سرکاری فرائض کے سلسلے میں انہی میں شامل ہونے جارہا تھا مگر ۱۸۰۰ کلومیٹر میں پھیلے ہوئے وسیع ہندوستانی علاقے کے اوپر پرواز کرتے ہوئے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ اگر ہندوستان نے ہم پر حملہ کردیا تو کیا پچیس ہزار فوجی مؤثر طور پر مشرقی پاکستان کا دفاع کرسکیں گے۔''(۳)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بھارتی مداخلت سے پاکستان دو حصوں میں بٹ گیا لیکن اس کے لیے سازگار حالات ہمارے اپنوں نے فراہم کیے۔وسائل کی تقسیم میں ناانصافی،معاشی استحصال اور اپنے ہی گھر میں بیگانگی کے عالم نے مشرقی پاکستان کو علیحدگی کے دھارے کی طرف دھکیل دیا کیوں کہ مشرقی پاکستان کی بڑی تعداد مغربی پاکستان کے حکمران اراکین کو آقا سمجھتی تھی۔آقاؤں کے سلوک کی جھلک بھی صدیق سالک اپنے ایئرپورٹ پر پہنچنے کے واقعہ سے یوں دکھاتے ہیں:

> ''تھوڑی دیر بعد ایک فوجی جیپ میرے پاس آکر رکی۔حوالدار نے مجھے سمارٹ سا سلیوٹ کیا اور پاس سے گزرتے ہوئے ایک بنگالی لڑکے کو جھبک دار لہجے میں حکم دیا۔'صاحب کا اٹیچی کیس جیپ میں رکھو' سہمے ہوئے لڑکے کو یہ جھبک ناگوار تو گزری مگر اپنے آقا پر ایک احتجاجی نگاہ ڈالتے ہوئے حکم بجالایا۔اس نے گھور کر میری طرف بھی دیکھا۔اس کے سیاہ چہرے کے چوکھٹے میں سفید سفید آنکھیں وحشت کا احساس لیے ہوئی تھیں۔میں نے اپنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالا اور چند سکے اس غریب لڑکے کو دینے چاہے مگر حوالدار نے پرزور لہجے میں کہا''سر ان حرام زادوں کی عادت نہ بگاڑیے''میں نے مشورہ مان لیا اور بنگالی لڑکا

ایک بار پھر نفرت کی نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔''(۵)

دراصل یہ کتاب شام غریبوں کی اس سیاہی کی روداد ہے جس نے سوہنی دھرتی کے ماتھے پر شکست دریخت کا وہ ٹیکا لگا دیا کہ آج بھی اس کا بدنما داغ اس کی خوبصورتی کو گہنا دیتا ہے۔الیاس بابر کے مطابق:

''کتاب بہت سے آنکھوں دیکھے واقعات سے بھری پڑی ہے۔قاری کے لیے ہر لفظ ایک آہ کا سبب بنتا ہے۔ایک بلاک میں سب کچھ لکھنا ممکن نہیں۔''(۶)

یہ کتاب جاگیردارانہ نظام کے خلاف ایک ایسی صدائے احتجاج ہے جس میں ہلکے پھلکے مزاح کی آڑ میں تیکھی تنقید اور سیدھے سادھے طرز تحریر میں میں چھپا پیچیدہ انتقاد پایا جاتا ہے۔جس میں الفاظ تو شاید تازیانہ محسوس نہ ہوں لیکن ان کی گہری معنویت کے نشتر ضرور محسوس ہوتے ہیں۔صدیق سالک خود ایک غریب گھر کے چشم و چراغ تھے اور غریب گھر میں پیدا ہونے والے ناکردہ گناہ کی پاداش میں ملنے والی سزا سے بخوبی واقف تھے۔اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کہنے کو والد صاحب کے پاس تھوڑی سی زمین تھی اور وہ چوہدری بھی کہلاتے تھے مگر زمین بارانی تھی اگر بروقت بارش ہوگئی تو سبحان اللہ ورنہ نوبت فاقہ کشی تک پہنچ جاتی۔ہمارا گھرانہ متوسط سے بھی کچھ نیچا گھرانہ تھا لہٰذا بچپن ہی سے لاشعور میں اپنے علاقے اور اپنی غربت کے علاوہ تعلیمی پسماندگی کا احساس بھی شدید رہا۔''(۷)

صدیق سالک شانتی نگر میں جابر علی خان کی امارت میں اور دوسری طرف عام غریب لوگوں کی کسمپرسی کے درمیان آسمان وزمین کے فرق کو بڑی خوبصورتی سے واضح کرتے ہیں۔یہ قانون خداوندی ہے کہ ازل سے کہ جہاں جاگیردارانہ نظام برسرِ اقتدار آتا ہے وہاں نچلہ طبقہ ان کے ظلم وستم کا شکار ہوتا ہے۔شاید قدرت کو بیک وقت امتحان وآزمائش دونوں مقصود ہوتے ہیں کہ اوّل الزکر فراوانی نعمت پر کس طرح شکر بجالاتا ہے اور آخرالذکر جبر واستبداد کے سامنے کس قدر صبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔

شانتی نگر میں جہاں ملک کی حویلی کے کلس آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور حویلی کی ہر چیز امپورٹڈ ہونے کی دعویدار ہوتی ہے وہاں پر بابا کلواس کی بیوی پھلاں اور بیٹی سکینہ گھر کی چھت سے ہندوؤں کے اس متروکہ کنویں سے اینٹیں نکالنے پر مجبور ہوتے ہیں جہاں وہ مردے جلایا کرتے تھے۔ایک طرف بیگم رکیہ کی آنکھ کے پاس تل کو ہٹانے کے لیے بیرون ملک علاج کی مد میں لاکھوں خرچ ہوتے ہیں تو دوسری طرف شریفاں ٹی۔بی کے مرض سے ملتی جلتی علامات لے کر خالق حقیقی سے جا ملتی ہیں۔کیونکہ اس غریب کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانے سے زیادہ آسان اپنے رب کے پاس جانا تھا۔صدیق سالک نے مفلسی کی چکی میں پسنے والے مجبور طبقے،قناعت پسند بہشتی بابا اور جاہ وحشمت کی علامت ملک جابر کی حویلی اور اس کے مکینوں کی آسودہ اور آسائش زندگی کو اتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ ہر کردار کی چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔شخصیت نگاری اور واقع نگاری کے بہترین مرقع پائے جاتے ہیں۔خاص طور پر ملک جابر علی خان کے کردار کو اس طرح پورٹریٹ کیا گیا ہے کہ چند الفاظ سے ہی اس کی جابرانہ ذہنیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔کھیتوں میں کام۔کرنے والا غریب کسان فرمان شدتِ پیاس کی وجہ سے اس انجانے میں اس مٹی کے پیالے میں پانی پی لیتا ہے جس میں ملک جابر پیا کرتا تھا تو اس پر ملک جابر کا شدید ردعمل اور اپنے بڑے بیٹے پرویز سے مکالمہ اس کی متکبرانہ ذہنیت کی غمازی کرتا ہے:

''آپ نے اچھا کیا کہ پھتو کے بھتیجے کو نوکری سے نہیں نکالا لیکن میرے خیال میں اتنی چھوٹی سی بات پر غصہ دکھانے اور پیالہ توڑنے کی ضرورت نہ تھی۔اچھا ہوا تم نے پوچھ لیا دیکھو، نقصان تو صرف مٹی کے پیالے کا ہوا ہے جو ویسے بھی پرانا ہو چکا تھا اور میں اسے رد کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس پیالے سے نجات کے ساتھ ساتھ نوکروں کو بھی سیدھا کر دیا۔اب کم از کم وہ ایک ہفتے تک اس واقعے کا ذکر کرتے رہیں گے اور جوں جوں یہ بات پھیلے گی تمام نوکروں پر رعب پڑھے گا۔کوئی سی تک نہ کر سکے گا۔یہ ہفتہ وار ڈوز (Dose) بہت ضروری ہوتی ہے جب تک ان کمیوں کو دبا کر نہ رکھا جائے۔یہ کام نہیں کرتے اور اگر ڈھیل دی جائے تو گلے کو آتے ہیں۔سمجھے۔''(۸)

انھوں نے امروز کے جمعہ میگزین میں ''ایمر جنسی'' پر لکھے ہوئے ایک تبصرے کے جواب میں نسیم شاہد کے نام خط لکھا جس میں وہ ان کہی باتوں کو سمجھنے پر مشکور تھے جنھیں کہنا صدیق سالک کے لیے مناسب نہ تھا:

''مجھے دلی مسرت اس بات سے ہوئی کہ آپ تقریباً تقریباً اس نکتے تک پہنچ گئے ہیں جسے میں نے کئی استعاروں میں ملفوف کر کے 'ایمر جنسی' میں بند کر دیا تھا۔نسیم شاہد صاحب اسے میرے دل کی آواز کہیے۔''(۹)

''سلیوٹ''

''سلیوٹ''، بریگیڈیئر صدیق سالک کی عسکری یادداشتوں پر مشتمل کتاب ہے جو ان کی وفات سے تھوڑا عرصہ بعد شائع ہوئی۔اس میں انھوں نے اپنی عسکری زندگی کے واقعات کو نچوڑا ہے۔صدر ایوب، جنرل یحیٰ خان، جنرل اسحاق خان، جنرل یعقوب خان اور امیر عبداللہ نیازی جیسی عہد ساز شخصیات کے بارے میں بھی لکھتے ہیں لیکن صرف ایک یا دو واقعات جو بہر حال شخصیت نگاری کے اصول کو تو پورا نہیں کرتے لیکن ''عقل مند اشارہ کافی است'' کے مصداق وہ بھی کافی ہیں۔سلیوٹ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے جب اپنی عسکری زندگی کی یادداشتیں رقم کرنے کا ارادہ کیا تو میرا خیال تھا کہ میرے دامن میں بہت کچھ ہے۔لکھنے بیٹھا تو محسوس ہوا کہ کچھ بھی نہیں۔مجھے جس واقعے کا جتنا سراغ ملا اور جس شخصیت کو جس روپ میں دیکھا رقم کر دیا۔میں نے وقائع نگاری کی آڑ میں افسانہ طرازی کی ہے نہ شخصیت نگاری کی آڑ میں کردار کشی۔میری نظر واقعات کی صحت اور میری سماعت ضمیر کی آواز پر رہی اور مجھے خودنوشت کا اس سے بہتر اسلوب معلوم نہیں۔''(۱۰)

لفظوں کی سادگی، برجستگی اور بے ساختگی ان کی تحریروں کا حسن ہے۔سادہ دیہی زندگی، گاؤں کے بزرگوں کا اچھی نوکری حاصل کرنے پر اصرار بحیثیت کپتان ان کی سلیکشن کا واقعہ اور رجمنٹل سنٹر میں فوجی تربیت ہلکے پھلکے لیکن پختہ مزاح کی بہترین مثالیں ہیں۔اپنی ٹریننگ کے پہلے دن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پہلے عموماً دو بار چہرے پر بلیڈ پھیرتا تھا آج تین بار پھیرا کہیں افسری میں کسر نہ رہ جائے

خوب مل مل کر غسل کیا۔نئی وردی اور چمکتے بوٹ پہنے۔شیشے میں اپنی شکل دیکھی تو پہچانی نہ گئی۔کہاں ڈھیلا ڈھالا سا پروفیسر جو اکثر بش شرٹ اور کبھی کبھی سوٹ پہنتا تھا اور کہاں کسا کسایا کپتان جو عمر میں کم از کم دس سال چھوٹا لگتا تھا۔وردی کو کلف لگی تھی۔کندھوں پر کپتانی سجی تھی۔اس فضا میں ایبٹ آباد کے سبزہ زار ، بلندوبالا پہاڑ اور سجیلے یوکلپٹس بہت بھلے لگے۔''(۱۱)

''تادمِ تحریر''

صدیق سالک ایک ہمہ جہت ادیب تھے۔اُردو مزاح نگاری میں اس کتاب کو خاصی شہرت حاصل ہے۔جس میں طنز ومزاح اور صرف ہنسنے ہنسانے کا کام ہی نہیں لیا گیا بلکہ غور وفکر کا پیام ہے۔یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔پہلا حصہ ''ایکسرے'' کے نام سے ہے جس میں مضاحیہ مضامین ہیں۔قومی وحکومتی اداروں پر گہری طنز یہ چوٹ ہے۔دوسرا حصہ ''سفر نامے'' ہیں جن میں یورپ، مشرقِ وسطی کے ممالک اور چین کے سفر نامے کے احوال ہیں۔دراصل صدیق سالک بیرونِ ملک سرکاری دوروں پر جاتے تھے۔دورے محدود ہونے کے باعث سفر نامے بھی چھوڑے ہیں۔تیسرا حصہ ''قندِ مکرر'' کے نام سے ہے جس میں کل سات مزاحیہ مضامین ہیں۔چوتھے اور آخری حصہ میں تقاریر ہیں جسے ''ریڈی میڈ تقریریں'' کا نام دیا گیا۔حصہ ''ایکسرے'' میں لکھتے ہیں:

''دریچہ اول میں آپ کو پاکستان اور اس کے چند اعضائے رئیسہ کی ایکسرے رپورٹس ملیں گی۔مثلاً اسلامی جمہوریہ پاکستان، مارشل لا، اقتدار اور جمہوری آئین وغیرہ۔ہر ایکسرے رپورٹ تشویشناک نہیں لیکن جس ایکسرے میں کوئی داغ نظر آئے اس کی طرف خود ہی توجہ دینا ضروری ہے۔''(۱۲)

کتاب کا طرزِ تحریر اگرچہ سادہ ہے اور مزاح پر مبنی ہے لیکن اس مزاح میں بہت سی ایسی حقیقتیں چھپی ہیں جن کا اظہار اس سے بہتر طریقے سے شاید ممکن نہیں تھا۔وہ خود بھی ان تلخیوں سے بخوبی آگاہ تھے اور اسی کے پیشِ نظر دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''ان چاروں دریچوں پر مبنی یہ کتاب سراسر غیر سنجیدہ کوشش ہے جس کے کسی حصہ پر سنجیدگی سے غصہ ہونا اس کے ساتھ بہت بڑا مذاق ہوگا اس کے علاوہ اگر آزادی کا پہلو نکلتا ہے تو ہیشگی اور تحریری معذرت حاضر ہے۔''(۱۳)

''پریشر ککر''

''پریشر ککر'' سوانحی ناول کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے۔یہ ایک علامتی ہے (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے) صدیق سالک کے مطابق انسان روز پریشر برداشت کرتا ہے جس میں جبر واستبداد کو چپ چاپ سہتے رہنا، اس کا مقدر بنا دیا جاتا ہے۔ناانصافی اور ذہنی کرب کے آلا واس اندر ہواندر گھٹتے رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں کچھ لوگ اس سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں جو نہیں کر پاتے وہ ''پریشر ککر'' کی طرح پھٹ پڑتے ہیں۔وہ اس کتاب کا انتساب ایسے ہی لوگوں کے لیے کرتے ہیں۔''اپنے اپنے ''پریشر ککر'' میں گلنے والے انسان'' بنیادی طور پر اس ناول کا مرکزی کردار فطرت ہے جو ایک آرٹسٹ ہے۔جس کی حساس طبیعت حالات سے مطابقت نہیں رکھ پاتی۔وہ اپنی مرضی سے جو تخلیق کرنا چاہتا ہے تو 'اشتراکیت' کا لیبل لگا کر روک دیا جاتا

ہے۔اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لا سکنے کا غم سماج کے ٹھیکیداروں کے ہاتھ کٹ پتلی نہ بننے کا جرم اور معاشی بحران ایسے شدید ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ناول کا اختتام المیہ پر ہوتا ہے جس کا نتیجہ فطرت کے پاگل ہونے کی صورت میں نکلتا ہے۔فطرت اپنے ذہنی کرب و کیفیت کو خود اپنے کولیگ شمسی سے بیان کرتا ہے:

''میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میں ایسی چمنی میں بدل گیا ہوں جو نہ آٹا پیسنے والی چکی کی طرح پھک پھک کر سکتی ہے نہ بھٹے کی چمنی کی طرح دھواں باہر پھینک سکتی ہے۔بس ہر شے اندر ہی اندر ہر غم اندر ہی اندر سہتے رہو، سلگتے رہو مگر بولو مت کھومت۔'' (۱۴)

فطرت کے کردار میں کہیں کہیں صدیق سالک کے اپنے کردار کی مطابقت بھی پائی جاتی ہے۔فطرت کی چھوٹی عمر میں یتیمی، ماں کا بڑی تنگ ودو کے ساتھ بچوں کو پالنا، غریب، گاؤں کے بزرگوں کا فطرت کو فوج میں بھرتی ہونے کا مشورہ اور کچھ نہیں تو پٹواری یا گرداور ہونے پر اصرار کرنا۔ایم اے کرنے کے بعد مختلف نوکریاں کرنا۔گاؤں میں تار کا آنا، کسی ناگہانی صورت کا سندیسہ سمجھا جانا اور فطرت کا گاؤں میں گاڑی لے کر آنا ''سلیوٹ'' میں صدیق سالک کی زندگی کی جھلکیاں ہیں۔ڈاکٹر عبادت بریلوی ''پریشر ککر'' کے بارے میں کہتے ہیں:

''یہ معاشرہ جس میں ہم سب رہتے ہیں اور رہنے کے لیے مجبور ہیں واقعی ایک پریشر ککر ہے۔آس پاس اور گرد و پیش میں جہنم کی سی آگ ہے۔اس گرمی کی شدت سے افراد پگھل گئے ہیں اور اس سے باہر آنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔'' (۱۵)

''پریشر ککر'' کے زندہ کرداروں کو ناقدین نے بھی محسوس کیا لیکن نام لینے سے گریزاں رہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں:

''اس میں ہمارے اردگرد کے افراد کے چہرے صاف نظر آتے ہیں۔ناموں کو تھوڑا سا بدل دیا جائے تو وہ اصل روپ میں ہمارے سامنے آ جائیں۔'' (۱۶)

اُردو زبان وادب میں بریگیڈیئر جنرل صدیق سالک اپنے فن و فکر اور اسلوب کی وجہ سے ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔تلخ سے تلخ حقیقت کو مزاح کی چاشنی میں لپیٹ دینے کا فن ان کی ادبی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''ہمہ یاراں دوزخ'' کی کال کوٹھری کا تذکرہ ہو جہاں روشنی بقدر بیضہ سوز بھی دستیاب نہ ہو یا ''ایمرجنسی'' جاگیردارانہ نظام زندگی، ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' کے غم واندوہ کے واقعات کو قلم بند کرنا ہو یا ''پریشر ککر'' میں ذہنی کرب کا اظہار۔''سلیوٹ'' میں یادداشتوں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا ہو یا ''تادم تحریر'' کے متفرق مضامین ان کا منفرد لہجہ اور نیا انداز بیاں، پورے اردو ادب میں کم ہی دکھائی دیتا ہے۔وہ حقیقی مفہوم میں نباض شناس تھے۔انھوں نے اپنے فلسفیانہ مزاح اور مسحور کن شگفتہ بیانی کے اعجاز سے اردو نثر نگاری کے دامن کو گل ہائے رنگا رنگ سے بھر دیا جو ہمیشہ اردو ادب کو مہکاتے رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، لاہور: مکتبہ اردو ڈائجسٹ، جنوری ۱۹۷۵ء، ص:۶۲

۲۔ ایضاً، ص:۱۵۹

۳۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، راولپنڈی: مکتبہ سرمد، ۱۹۸۶ء، ص:۱۴
۴۔ ایضاً، ص:۱۵
۵۔ الیاس بابر محمد، webdesk,by، ۱۶دسمبر ۲۰۱۶ء
۶۔ مقبول جلیس، facebook,by، سیلف میڈ لوگ
۷۔ صدیق سالک، ایمرجنسی، راولپنڈی: مکتبہ سرمد، ۱۹۸۵ء، ص:۳۵
۸۔ خط بنام نسیم شاہد، مشمولہ: امروز، روزنامہ، ۱۵فروری ۱۹۸۶ء
۹۔ صدیق سالک، دیباچہ: سیلوٹ، لاہور: نقوش پریس، ۱۹۸۹ء، ص:۲
۱۰۔ صدیق سالک، سیلوٹ، ص:۲۱
۱۱۔ صدیق سالک، تادمِ تحریر، راولپنڈی: مکتبہ سرمد، ۱۹۸۱ء، ص:۴۱
۱۲۔ صدیق سالک، دیباچہ: تادمِ تحریر، ص:۳
۱۳۔ صدیق سالک، پریشر ککر، لاہور: نقوش پریس، ستمبر ۱۹۸۳ء
۱۴۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ادبی مذاکرہ، مشمولہ: جنگ، روزنامہ، ۱۴دسمبر ۱۹۸۳ء
۱۵۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ادبی مذاکرہ، مشمولہ: جنگ، روزنامہ، ۱۴دسمبر ۱۹۸۳ء

☆......☆......☆